ہے اور قرآن مجید اور احادیث نبویہ سے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے مقرب اور خاص بندے مصیبت کے وقت جزع وفزع نہیں کرتے اور امام صاحب کا لقب ہی زین العابدین ہے انکی شان ارفع سے یہ امر بعید ہے کہ وہ مصیبت کے وقت موجودہ زمانہ کے کذاب ذاکرین کا طریقہ اختیار کریں۔ البتہ ہمیں ملک صاحب کی اس بات سے اتفاق ہے کہ کہ موجودہ کذاب ذاکرین کے بین کی ایجاد ہی سرائیکی زبان میں ہوئی ہے اس لئے نہیں کہ حضرۃ علی بن حسینؓ نے سرائیکی میں یہ مرثیہ خوانی کی تھی بلکہ اس لئے کہ یہ رسم بد ان ذاکرین ہی کی ایجاد کردہ ہے ہاں تاریخی اعتبار سے انکا یہ دعویٰ غلط ہے اس لئے کہ صدر اسلام میں شہادت حضرۃ حسینؓ کے بعد اس طریقے کی مجالس کا وجود ہی نہیں تھا۔ بلکہ یہ رسم بد ماہی گیروں کے خاندان سے تعلق رکھنے والے آل بویہ کے رکن معز الدولہ نے اپنے دور اقتدار میں ۳۵۱ھ کو بغداد میں ایجاد کی ملک صاحب سے یہ سوال بھی ہو سکتا ہے کہ اگر آپ کی ہی تحقیق کے مطابق بین کی ایجاد سرائیکی زبان میں ہوئی ہے تو پھر ان کو مرثیہ اور نوحہ کیوں کہتے ہیں ؟ یہ تو خالص عربی زبان کے لفظ ہیں اور ان سے یہ مطالبہ بھی ہے کہ وہ کسی مستند تاریخ سے سیدنا علی بن حسین یعنی زین العابدین کے سرائیکی زبان کے مراثی کی نشاندھی کریں اور پھر ملک صاحب کے علمی ذوق کی داد دیجئے کہ آپ فرماتے ہیں کہ :

”قرآن مجید کا جو بین سرائیکی زبان کے انداز میں تاثیر اور طریقے اور چاشنی نے پیش کیا ہے دوسری زبان والوں کو یہ درجہ حاصل نہیں ہو سکتا“

یہ قرآن مجید تو نہ ہوا بلکہ خواجہ صاحب کا دیوان یا لطف علی کی سیف الملوک ہے ایک آدمی جب عربی لغت اور زبان سے واقف ہی نہیں اس کو کیا معلوم کہ عربی بلاغت و فصاحت میں کیا اثر اندازی کا وصف ہے۔ اس پر مزید تحریر کرنے کی بجائے ہم ملک صاحب کے متعلق ایک شعر پر اکتفاء کرتے ہیں :

؎ زاغ چوں فارغ ز بوئے گل بود
نفرتش از صحبت بلبل بود

لیڈری : بینک بیلنس، بیوک، بنگلہ، بیگمات
کتنی مہنگی لیڈری ہے آج کل!
واہ یکطرفہ ٹریفک کا کمال!
ہر سڑک تیری گلی ہے آج کل

—— (مجید لاہوری)

حافظ صفوان محمد
بہاولپور

بیادِ امیرِ شریعت

شبِ سیاہِ غلامی میں نور کی قندیل

برصغیر کے ایک بہت بڑے مستشرق نے ایک بار آخرت کے لئے اپنے زادِ راد کے بارے میں کہا تھا۔ "جب اللہ مجھ سے یہ پوچھے گا کہ دنیا میں آخرت کے لئے کیا سامان کیا تو میں کہوں گا کہ حالیؔ سے مسدسِ حالی (مدّ و جزرِ اسلام) لکھوا کر لایا ہوں" مدّ و جزرِ اسلام کا اسم با مسمیٰ ہونا قطعاً لاریب ہے لیکن جب یہی سوال مجھ سے ہوتا تو میرا جواب یہ ہوگا۔ "اے اللہ! میں نے شاہ جیؒ کی صحبت اگرچہ نہیں پائی لیکن اُن کے مشن کو حق سمجھا، ان کے افکار پر غور و فکر اور انکے ارشادات پر عمل کرنے میں اپنی سی سعی ضرور کی۔

یہ تقریباً ساٹھ برس اُدھر کی ایک بہت خاموش وسطِ شب کا واقعہ ہے کہ فضا، اچانک نعرہ ہائے تکبیر اور نعرہ ہائے رسالت کی فلک شگاف صداؤں سے لرز اُٹھی پھر اہلِ لاہور نے دس بارہ ہزار افراد کے ایک ہجوم کو باغبان پورہ کی طرف بڑھتے دیکھا۔ اسی ہجوم پر ایک نظر ڈالنے سے نگاہ چمکتی ہوئی بڑی بڑی آنکھوں، سُرخ و سفید نورانی چہرہ، مہکتی داڑھی اور لمبے بالوں والے ایک کھدّر پوش بزرگ پر جا کر رُک جاتی تھی۔ یہ سیّد عطاء اللہ شاہ بُخاریؒ تھے جو ابھی چار گھنٹے قبل نمازِ عشاء پڑھانے کے بعد لوگوں سے چند باتیں کہنے کے لئے کھڑے ہوئے تھے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے یہ تھوڑے سے لوگ ایک بڑے مجمع میں بدل گئے۔ بات انجینئرنگ کالج لاہور کے پرنسپل سے متعلق تھی جس پر الزام تھا کہ وہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ عالی میں گستاخی کا مرتکب ہوا ہے۔ پرنسپل کی اس مذموم حرکت پر چند غیور مسلمان طلبہ مشتعل ہو گئے۔ اور اس اشتعال نے بڑھتے بڑھتے چند ہی روز میں ایک بڑی تحریک کی صورت اختیار کر لی جس کی قیادت کی پاداش میں مولانا احمد علی لاہوریؒ اور مولانا داؤد غزنویؒ کو گرفتار کر لیا گیا تھا۔ یہ رات کے کوئی ایک بجے کا عمل ہو گا جب ناموسِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر مدلّل اور متنوّع تقریر لوگوں کو بار بار رُلا اور تڑپا رہی تھی۔ پھر یہ مجمع اچانک اُٹھ کھڑا ہوا۔ طے یہ پایا تھا کہ نمازِ فجر کالج کے سامنے ادا کی جائے اور وہیں سے ناموسِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کے لئے اپنا فرض ادا کرنے کا آغاز کیا جائے۔

کہنے والے کہتے ہیں کہ انسانوں کے اِس ٹھاٹھیں مارتے دریا میں کوئی بھی شخص ایسا نہ تھا جس کے قدم انجینئرنگ

کالج کی بجائے اپنے گھر کی طرف اُٹھے ہوں۔

امیر شریعت حضرۃ سید عطاء اللہ شاہ حسنی قادری بخاریؒ جنہیں چاہنے والے شاہ جی اور ماننے والے مجدد خطابت، سلطان المتکلمین، امام المجاہدین، سید الاحرار اور مؤسس تحریک تحفظ ختم نبوۃ کہتے تھے یکم ربیع الاول (یعنی چاند رات) ۱۳۱۰ھ مطابق ۲۳ ستمبر ۱۸۹۱ء کو جمعہ کی سحر ہندوستان کے صوبہ بہار کے شہر پٹنہ میں پیدا ہوئے۔ ددھیال سے عطاء اللہ اور ننھیال سے شرف الدین احمد نام تجویز ہوا۔ والد گرامی کا نام سید ضیاء الدینؒ اور دادا کا نام سید نور شاہؒ تھا۔ نسب نامہ چھتیسویں پشت میں حضرت سیدنا حسن مجتبیٰ رضی اللہ عنہ سے جا ملتا ہے۔ آپ کے خلف الرشید حضرۃ سید ابو معاویہ ابوذر بخاری مدظلہ العالی کی تالیف "سوانح الالہام" کے مطابق آپ کے خاندان میں سید الاولیاء حضرۃ سید عبدالقادر جیلانیؒ اور سید محمد شاہؒ جیسے جلیل القدر بزرگ ہو گزرے ہیں۔ ایک اور خدا رسیدہ بزرگ سید عبدالرسولؒ تھے جن کے بارے میں مورخ کشمیر منشی محمد الدین فوقؔ نے لکھا ہے، "تقویٰ کا یہ عالم تھا کہ مرغی کا انڈہ اور مرغ صرف اس لئے نہیں کھاتے تھے کہ یہ دانہ دُنکا لوگوں کے گھروں میں بھی جا کر کھا لیا کرتے ہیں۔" شاہ جیؒ کی والدہ محترمہ سیدہ فاطمہ اندرابیؒ کا شجرہ حضرت خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ سے جا ملتا ہے۔

۱۹۱۴ء تک آپؒ نے قرآن پاک کے حفظ کے ساتھ ساتھ صرف و نحو اور فقہ کی بعض کتب کی تعلیم مکمل کی۔ اسی سال آپ کا عقد آپ کے والد کے چچیرے بھائی سید مرتضیٰ شاہؒ کی دختر گرامی سے ہوا۔ ۱۹۱۵ء میں آپ نے امرتسر کو مستقر بنا لیا اور حضرت پیر مہر علی شاہ صاحب گولڑوی رحمۃ اللہ سے بیعت ہوئے۔ اور تادم واپسیں حضرۃ سے تعلق رہا۔ آغاز تعلق کے ایام کے بارے میں فرماتے تھے کہ: "اس زمانہ میں بے حد وظائف کرتا تھا۔ طبیعت میں بہت جلال تھا۔ جب کہیں گزرتا تھا تو درخت اور دیواریں پیچھے ہٹتی نظر آتی تھیں"۔ اُسی زمانہ میں شاہ جی حضرۃ مولانا غلام مصطفیٰ قاسمیؒ کے درس میں شامل ہوئے۔

شاہ جیؒ کے قرآن پڑھنے کا انداز جب عام ہوا تو لوگ انہیں شبینوں پر بُلانے لگے۔ گھروں سے نکل کر آواز گلی کوچوں پھر بازار تک آن پہنچی۔ آخر وہ وقت آ گیا جب لوگوں نے حضرت قاسمیؒ کو مجبور کیا کہ وہ سید عالی کو کھلے میدان میں تقریر کی اجازت دیں۔ چنانچہ پہلی تقریر اندرون گلوالی دروازہ بازار کھہاراں امرتسر میں ہوئی۔ ایک اور صاحب آپ کو نواحی قصبہ سلطان ونڈالے گئے۔ ۱۹۱۶ء میں کوچہ جیل خانہ کے لوگ پیہم اصرار سے آپ کو امامت کے لئے لے گئے۔

فرمادی کہ آپ ہال بازار کی مسجد خیر الدین میں حضرت مولانا نور احمدؒ اور حضرت مفتی محمد حسن سے سبق جاری رکھیں۔ دسمبر ۱۹۱۹ء میں مولانا شوکت علیؒ کی صدارت میں خلافت کانفرنس امرتسر کے گول باغ میں منعقد ہوئی جس میں پہلی مرتبہ سید عالیؒ نے سیاسی تقریر کی۔ حاضرین اس درجہ متاثر ہوئے کہ کمیٹی کے لئے دس لاکھ روپے چندہ جمع ہو گیا۔ یہ وہ وقت تھا جب ہندوستان خفیہ پولیس کی جانب سے تیار کردہ ایک فتویٰ پر مشرق وسطیٰ اور ہندوستان کے مقتدر علماء سے اس مضمون کے دستخط حاصل کئے گئے تھے کہ آل عثمان خادم حرمین شریفین ہونے کے باوجود برطانوی استعمار سے برسر جنگ ہونے کی وجہ سے دائرہ اسلام سے خارج اور کافر ہیں۔

رولٹ ایکٹ کی وجہ سے ملک کی سیاسی فضا میں ایک گونہ ارتعاش اور حدت پیدا ہوئی جس سے متاثر ہو کر مسلمانانِ ہند نے جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کے بعد پہلی مرتبہ اپنے جیالے رضا کار اور بہترین دماغ پروانہ وار فدا کر دیئے۔ چند ہی یوم میں یہ عوامی تحریک ملاّت اور کوٹھیوں سے جھونپڑیوں، مساجد، پاٹھ شالاؤں اور گوردواروں تک پھیل گئی۔ ایسے ہمہ گیر جذباتی دور سے ناممکن تھا کہ سید عالیؒ متاثر نہ ہوتے۔ جوانی کا عالم تھا، قدرت نے خوش روئی کے علاوہ خوش گلوئی کی نعمت بھی ودیعت کر رکھی تھی، چنانچہ ۱۹۱۶ء اور ۱۹۱۹ء کا واعظ اور خطیب عام آسائشوں کو تیاگ کر میدانِ عمل میں اس بے جگری سے کود پڑا کہ ماضی قریب و بعید کے بزرگانِ عظمت و استقلال کی درخشندہ تاریخ کو ایک نعرۂ عشق سے روشن اور اُجاگر کر دیا۔ مولانا سید محمد داؤد غزنویؒ محلے کی مسجد سے اُٹھا کر انہیں سیاست کی سٹیج پر لے آئے اور ابھی چند ماہ نہ گزرے تھے کہ حضرت شاہ جیؒ کی شہرت اکنافِ ہند میں پھیل گئی۔

سیاسی اور اصلاحی مدوجزر میں وہ کون سا مقام آیا جہاں کلمۂ حق کو ببانگِ دہل بلند کرنے کی حاجت ہوئی اور یہ شیرِ خدا نتائج سے بےخبر بے نیاز ہو کر وقت کے فراعنہ اور نمارود سے نبرد آزما ہونے کے لئے سب سے اونچے مقام پر نہ دیکھا گیا ہو۔ آزادی کی جنگ ہو یا انگریز کی سلام دشمنی کے خلاف جہاد، سردارِ دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم کی ناموس پر حملوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنا ہو یا بدعات کے خلاف تحریک۔ حضرتؒ کا عمل سرفروشی کے لباس میں معاصرین میں سب سے زیادہ افضل اور مؤثر نظر آتا ہے۔ فتنۂ شاتم رسولؐ راج پال ہو یا مغلپورہ ایجی ٹیشن، کوئٹہ کے مفلوک الحال زلزلہ زدگان کی امداد ہو یا بے کس و مظلوم مسلمانانِ کشمیر پر ڈوگرہ شاہی مظالم، انتخابات کی سرگرمیاں ہوں یا تحفظِ ختمِ نبوۃ کے لئے جان کی بازی، غرض ہر مقام اور ہر منزل پر سید عالیؒ

سالارِ قافلہ کی حیثیت سے رجز خوانی کرتے ملے۔ اور ساتھیوں اور جانبازوں کے مقابلہ میں زیادہ سے زیادہ سزا کو ہنستے ہوئے قبول کرتے نظر آئے۔ وہ ایک ایسا بے باک اور مضطرب دل لے کر آئے تھے کہ اسلام اور مسلمانوں کی ہر مصیبت کے وقت بے تاب ہو جاتا۔ ان کی آواز اتنی پُر درد تھی کہ برصغیر اور بلادِ اسلامیہ کے لئے بے اختیار بلند ہو جاتی۔ ظلم کے خلاف انکی آواز اس قدر پُر اثر تھی کہ آن کی آن میں صورِ اسرافیل بن جاتی۔ آنکھیں عالمِ اسلام کی ہر تکلیف پر اشک آلود ہو جاتیں۔ ناممکن تھا کہ مظلوم کوشکنجہ میں جکڑا دیکھ کر خاموش رہیں۔ وہ قوم کی تکلیف پر خود روتے اور دوسروں کو رُلاتے تھے۔ انہوں نے مصر، ترکی، حجاز الغرض ہر خطہ کے مسلمانوں پر ظلم کے خلاف آواز بلند کی اور اُن کے مصائب و آلام پر نوحہ خواں ہوئے۔

۱۹۲۱ء میں مسجد خیر الدین میں ایک تقریر کرنے کی پاداش میں تین برس کے لئے میانوالی جیل میں بھیجے گئے جس کے بعد ریل سے جیل اور جیل سے ریل کا وہ لامتناہی سلسلہ شروع ہوا جو مسلسل چالیس برس تک جاری رہا۔ آپ کے مشن میں پیدل سفر سے لے کر اونٹ، گھوڑا، گدھا، بیل گاڑی، چھکڑے، موٹر کار، ریل اور بس سب کے سب استعمال ہوئے۔ آپ نے ہمیشہ تھرڈ کلاس کے سفر کو پسند فرمایا۔

زورِ خطابت کا جب تذکرہ ہوتا ہے تو ہمارے زمانے کے لوگ شیکسپیئر کے ڈرامہ جولیس سیزر میں انتونی کی تقریر پر سر دُھنتے نظر آتے ہیں۔ معلوم نہیں کہ اس تقریر کا حقیقت میں کتنا اثر ہوا تھا، لیکن سب اپنے اور غیر بارہا اس بات کا مشاہدہ کر چکے ہیں کہ ناموافق ماحول میں جب بھی سیّد عالیؒ تقریر کے لئے کھڑے ہوئے، عوام کے غم و غصّہ کو نعرہ ہائے تحسین و آفرین میں بدل دیا۔ جو لوگ جوتے لے کر آئے تھے۔ اپنی جیب سے آخری پائی تک نچھاور کر بیٹھے۔ جو کفر کا فتویٰ صادر کر چکے تھے۔ پھر ان کے ہاتھ تاحیات دُعا کے لئے اُٹھے رہے۔ ایک بار سیّد عالیؒ نے فرمایا: "میں وہاں چلا جاؤں گا جہاں سے لوٹ کر کوئی نہیں آیا۔ پھر تم مجھے پکارو گے لیکن تمہاری آواز تمہارے ہی کانوں سے ٹکرا کر تمہیں ہلکان کر دے گی۔ مگر تم مجھے نہ پا سکو گے؟

تو چاہنے والے زمین پر لوٹتے اور دھاڑیں مارتے تھے۔ بعض کمزور دل عشاق کے بارے میں سُنا کہ پھر لینگ کی پٹی سے ایسے لگے کہ لوگوں نے ہی اُٹھایا۔ حقیقت یہ ہے کہ شاہ جیؒ دِماغوں اور دِلوں کے حکمران تھے۔ وہ واحد شخص تھے جو سیاسی اقتدار، جماعتی رقابت اور تنظیمی خطوط کے بغیر اپنی ذات میں ایسا جادو رکھتے تھے کہ لوگ فقط ایک اشارہ پر سر دینے کو تیار ہو جاتے۔ بخاریؒ کی تقریر کسی بستی میں ہو اور لوگ رات گھر دل میں سو کر گزاریں، یہ ممکن نہ تھا۔ آپ نے اپنی فصاحت و بلاغت، خطابت اور علم کلام کی توپوں کے دہانے انگریز

کے شاہی قلعہ پر مرکوز کئے تھے۔ اختلافِ عقیدہ کے علاوہ کا دیانیوں سے غیر فانی کد کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ بانیٔ سلسلہ مرزائیت نے انگریزی حکومت کو ابرِ رحمت قرار دے رکھا تھا (ازالہ اوہام ص۱۳۲) اس وجہ سے انگریزی استعمار اور مرزائیت دو ایسے نشانے تھے جن پر حضرت شاہ جیؒ کے تیر اکثر ہمیشہ لگتے رہے۔ قادیانیت کا ابطال دراصل ختمِ نبوۃ کا اثبات ہے جو آپؒ کے ایمان کا تخم تھا۔ وہ حق اور حق پرستوں کی گویا ایسی تلوار تھے کہ جس باطل کے سر پر پڑتی، اُسے شق کر ڈالتی۔ وہ خُدائی بجلی یا آسمانی صاعقہ تھے کہ کفر وضلالت کے جس خرمن پر پڑتے، اُسے بھسم کر ڈالتے۔ وہ لحنِ داؤدی کا ایسا نمونہ تھے کہ حبیب و رقیب سب کو مسحور کر دیتے۔ وہ صورِ اسرافیل تھے جس کی حیات بخش دعوت سے مُردہ دلوں میں جان پڑ جاتی۔ جس کی ایک آواز پر پچاس ہزار رضاکار آزادیٔ کشمیر کے لئے سر پر کفن باندھ کر نکل آئے۔ جس کے ایک اشارے پر متحدہ ہند کے جیل خانے بھر جاتے۔ جس کا داخلہ ایوانِ مرزائیت قادیان میں زلزلہ ڈال دیتا۔ جنگِ آزادی کے کارکنان سے پوچھیے کہ ان کی امروہہ والی تقریر ضرب المثل کے طور پر آج بھی یاد کی جاتی ہے کہ اس نے جنگِ آزادی کا حقیقی موڑ پیدا کیا۔

۱۹۲۹ء میں مجلس احرارِ اسلام قائم کی گئی۔ آریہ سماجیوں کی طرف سے توہینِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تحریک اپنے شباب پر تھی اور احرار ناموسِ رسُول اللہ کے لئے ہر قربانی دینے کا عہد کر چکے تھے۔ لاہور میں ناپاک کتاب (رنگیلا رسول) کے خلاف غم وغصہ کے الاؤ اُبل رہے تھے اور قوم مسلم لیگ کی بے عملی سے اُکتا کر مجلس احرار کے دامن سے عمل کی توقع وابستہ کر چکی تھی اور خواص سے بیزار عوام میں ہر ایک کی زباں سے "احرار کہاں ہیں؟" کی بے تابانہ صدائیں نکل رہی تھیں۔ اب وہ دن آ گیا جب لوگ جوق در جوق دھلی دروازہ کے باہر مجلس احرار کے دفتر کی طرف بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ یہاں تک کہ بارہ بجے کے قریب شاہ محمد غوثؒ کے مزار کے گرد باغات انسانی کھوپڑیوں کے گھنے جنگل بن گئے۔ سیّد عالیؒ نے فیصلہ کیا کہ آج ہمارا طریقہ صرف ایک ہی ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ شہر کے سرکاری رہنماؤں کو اُن کے حال پر چھوڑ کر اور ہر مصلحت سے آنکھ بند کر کے ناموسِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ہر وہ اقدام کیا جائے جس کی ضرورت ہو۔ چار بجے کے قریب بیگم اکبری دروازہ سے کوتوالی تک پھیل گیا تھا۔ بھاری جمعیت کو دیکھ کر سٹی مجسٹریٹ نے دفعہ ۱۴۴ کا نفاذ کر دیا۔ اب مفکرِ احرار چودھری افضل حقؒ کی رائے پر جلسہ وطن بلڈنگ کے احاطہ میں ہونا طے پایا۔ جلسہ یہاں بھی ممنوع قرار دے دیا گیا۔ اس صورتِ حال کو دیکھ کر آپؒ نے مشورہ دیا کہ اب حکومتی رہنماؤں سے ٹکر لینا ناگزیر ہو گیا ہے چنانچہ سول نافرمانی کا فیصلہ کر دیا گیا۔ بہرحال شاہ جیؒ بڑے طمطراق سے سٹیج پر تشریف لائے۔ ہمیشہ کی طرح ننگی تلواروں

کی سلامی دی گئی۔ خطبہ مسنونہ پڑھ چکے تو جلسہ گاہ میں موت کی سی خاموشی طاری ہو گئی۔ پھر ایک ہی آواز تھی جو دلوں میں گھر کرتی اور روح کو وجد میں لاتی جا رہی تھی۔ تقریر شروع ہوئی، تقریر کیا تھی۔ آنسوؤں اور شعلوں کا اجتماع تھا۔ جوش کی انتہا تھی۔ آہ و بکاء کی آوازیں ہر سمت سے اُٹھ رہی تھیں۔ آپؒ فرما رہے تھے "اے مسلمانانِ لاہور! آج فخرِ رسل صلی اللہ علیہ وسلم کی آبرو تمہارے شہر کے ہر ہر دروازے پر دستک دے رہی ہے۔ اے اُمتِ رسولؐ! آج ناموسِ محمدؐ کی حفاظت کا سوال درپیش ہے یہ سانحہ سقوطِ بغداد سے بھی زیادہ غم ناک ہے۔ زوالِ بغداد سے ایک سلطنت پارہ پارہ ہو گئی تھی مگر توہینِ رسول کے سانحے سے آسمانوں کی بادشاہت متزلزل ہو رہی ہے۔" پولیس کی جمعیت میں بے حد اضافہ ہو گیا تھا۔ جوں جوں رات گزرتی جا رہی تھی، پولیس والوں کے دل بے قابو ہو رہے تھے۔ آپؒ نے ان سے خطاب کرتے ہوئے کہا: "اے پولیس والو! ہم یہاں صرف ماتم کے لئے جمع ہوئے ہیں۔ تم کیا چاہتے ہو؟ اگر ہمیں گرفتار کرنا چاہتے ہو تو ہم حاضر ہیں اور اگر ہمارے ساتھ وہ سلوک مطلوب ہے، جو ایک سید زادہ کو وراثت میں ملا ہے تو ہمارے سینے اس کے لئے بھی حاضر ہیں۔" اس پر جلسہ میں (جو وطن بلڈنگ کے احاطہ میں ہو رہا تھا) شدید زور کی لہر اُٹھی اور لوگوں نے اپنی جانوں کے نذرانے پیش کر دیئے۔ تقریباً دس ہزار آدمی اس شب گرفتار ہوئے۔

۱۹۵۳ء کی تحریک تحفظ ختم نبوت کے دنوں میں لاہور سنٹرل جیل میں جب مارشل لاء کے قیدیوں سے آپ کی ملاقات کرائی گئی تو آپ ننگے پاؤں اور ننگے سر ان کے استقبال کے لئے دوڑے۔ آپ نے سب کو گلے لگایا ایک ایک کی بیڑی اور ہتھکڑی کو بوسہ دیا اور یوں گویا ہوئے: "تم لوگ میرا سرمایۂ حیات ہو۔ میں نے دنیا میں لوگوں کو روٹی یا پیٹ یا کسی مادی مفاد کے لئے نہیں پکارا۔ لوگ اس کے لئے بڑی بڑی قربانیاں دیتے ہیں۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت کے تحفظ کی دعوت دی ہے میں نے جب کراچی جیل میں گولی چلنے کے واقعات سُنے اور معلوم ہوا کہ کئی بوڑھے باپوں کی لاٹھیاں ٹوٹ گئیں۔ ماؤں کے چراغ گل ہو گئے۔ اور کئی سہاگ اُجڑ گئے تو مجھے اس کا بہت صدمہ ہوا۔ میں نے وہاں کہا تھا کہ کاش مجھے کوئی باہر لے جائے۔ ارباب اختیار تک میری آواز پہنچا دی جائے کہ تحفظِ ناموسِ رسولؐ کے سلسلہ میں اگر کسی کو گولی مارنا مقصود ہو تو وہ گولی میرے سینے میں مار کر ٹھنڈی کر دی جائے اور کاش اب تک جتنی گولیاں چلائی گئیں۔ مجھے ٹکٹکی پر باندھ کر میرے سینے میں مار کر ٹھنڈی کر دی جائیں۔"

۱۹۵۳ء

راقم کے دادا مولوی محمد صدیقؒ اسیری کے ان ایام میں حضرت شاہ جیؒ کے ہمراہ تھے۔ ان دنوں آپؒ ۱۳ فروری

کو بیرون دہلی دروازہ والی تقریر کے سلسلہ میں اسیر تھے یہ وہی تقریر تھی جس میں آپؒ نے اپنی ٹوپی اُتار کر کہا تھا۔ "کوئی ہے تم میں جو یہ ٹوپی خواجہ ناظم الدین (وزیراعظم پاکستان) کے پاؤں پر جاکر رکھدے اور یقین دلادے کہ وہ مجھے اپنا سیاسی حریف نہ سمجھیں، اگر وہ ناموس رسول کا تحفظ کریں تو میں پوری زندگی اُن کا خدمتگار رہونگا۔"

جلیانوالہ باغ کے حادثہ اور قبیح رسوم کے خلاف جہاد نے "سید عالیؒ" کو وہ مقام دیا کہ جہاں وعظ فرماتے۔ انسان ہی انسان نظر آئے۔ اُسی عہد میں ایک نئی تحریک نے جنم لیا تھا۔ مذہب کے گرد حصار کی نئی استوار ہونے والی دیوار کو گرانے کے لئے شب و روز مشورے ہونے لگے اور ایک ایسی جماعت کی تنظیم ہوگئی جس کے رزق کا انحصار کذب کے شجر کی آبیاری پر تھا۔ آپؒ کبھی کبھی بڑے جلال میں فرمایا کرتے تھے "ایک وقت آئے گا کہ تم لوگ ہماری قبروں پر آکر روؤ گے اور کہو گے کہ تمہی لوگ سچے تھے۔" انہی ایام کی ایک تقریر میں فرمایا :

"میں ان سؤروں کا ریوڑ بھی چرانے کو تیار ہوں جو برٹش امپریلزم کی کھیتی کو ویران کرنا چاہیں۔ میں کچھ نہیں چاہتا۔ ایک فقیر ہوں۔ اپنے ناناؐ کی سُنت پر مرمٹنا چاہتا ہوں۔ اور اگر کچھ چاہتا ہوں تو صرف اس مُلک سے انگریز کا انخلاء، دو ہی خواہشیں ہیں میری زندگی میں : یہ ملک آزاد ہو جائے یا میں تختۂ دار پر لٹکا دیا جاؤں۔"

ایک بار ضلع سورت میں سکھوں اور ہندوؤں کی دعوۃ پر ایک تقریر منظور فرمائی۔ اس تقریر کی تاثیر اور حلاوت نے سکھوں اور ہندوؤں سے اللہ اکبر کے نعرے بلند کرائے۔ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ بھی موجود تھے اسلام کی حقانیت، اللہ کی عظمت، توحید اور بُت پرستی کی قباحتوں پر حیرت انگیز بیان تھا۔

وہ بھی عجیب منظر تھا جب مئی ۱۹۳۰ء میں انجمن خُدام الدین کے اجلاس میں حضرت مولانا انور شاہ کاشمیریؒ نے آپ کو امیرِ شریعت کا خطاب دیا اور اپنے دونوں ہاتھ آپ کے ہاتھ میں دے کر بیعت کی۔ حضرۃ شیخؒ خود بھی زار و قطار رو رہے تھے اور سید عالیؒ کی آنکھوں سے بھی گویا آنسوؤں کا سیلِ رواں جاری تھا۔ آپؒ لاکھ انکار کرتے تھے، اور حضرت شیخؒ اصرار کرتے تھے۔ اس واقعہ کے بعد آپؒ کی شخصیت میں مقبولیت اور جاذبیت کا وہ دَور شروع ہوا جو اس سے قبل کبھی نہ تھا۔

وہ حریت و مساوات کی جنسِ گراں بار اُٹھائے زندگی کے بازاروں میں تقریباً نصف صدی تک لوگوں کو ہر لحظ بُلاتے رہے۔ انہوں نے اس گورستان میں برسوں اذانیں کہیں لیکن غلام رگوں کے منجمد خُون کو اپنی گرم گفتاری سے حرکت میں نہ لا سکے۔ اور یوں یہ بدنصیب لوگ اب شائد ہمیشہ کے لئے غلام ہوگئے۔ اگر بخاریؒ پہاڑوں

کو پکارتے تو شائد وہ خاکِ راہ بن کر ان کے دامن سے لپٹ جاتے۔ اگر ستاروں کو آواز دیتے تو وہ یقیناً اپنی قندیلیں زمین کے حوالے کر دیتے مگر آہ! بخاریؒ نے ان کے دروازوں پر سر ٹیکا جن کے دل خون سے تہی، آنکھیں بصارت سے محروم اور کان صدائے حق سے ناآشنا تھے یا بالفاظِ دیگر وہ لوگ ختم اللہ علی قلوبھم وعلی سمعھم وعلی ابصارھم غشاوۃ کی حقیقی تفسیر تھے۔ دردناک اور نمناک شگاف آواز کے ساتھ قرآن کا پڑھنا، مخالفین کے جلسہ پر قبضہ کرنا، عالم و جاہل اور مخالف و موافق سب کا یکساں طور پر متاثر ہونا ان کی وہ خصوصیات ہیں کہ ان کی ہمسری کر ہی نہیں سکتا۔ مخالفین کو ہم خیال بنانا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ بعض اوقات تو بولنے سے قبل ہی مجمع کو ایک ساحرانہ نگاہ سے مسحور کر دیتے تھے۔ سٹیج پر اگر کسی کی مٹی پلید کرنا ہوتی اپنے مخالف پر یوں حملہ آور ہوتے کہ ایسا خطیب کسی نے دیکھا ہوگا اور نہ کسی نے سنا ہوگا۔ فکری تحلیل سے وہ نقشہ کھینچتے تھے کہ دنیا کا کوئی مقرر ان کی نقالی نہیں کر سکتا۔ احرار کی قیادت کے زمانہ میں آپ کے دہنِ مبارک میں دو دھاری زبان اور باطن میں قلبِ جرار تھا جس نے قادیانیت کا جنازہ نکال دیا۔ مولانا محمد علی جوہرؒ کی خطابت اور قیادت دونوں مسلم الثبوت ہیں۔ ایک بار حضرۃ جیؒ کے بارے میں فرمایا: "ظالم سے نہ پہلے تقریر کی جا سکتی ہے نہ بعد میں۔ اس کے بعد تقریر کرنے والے کا رنگ نہیں جمتا اور اگر اس سے پہلے تقریر کریں تو اس کے اثر کو آکر یہ مٹا دیتا ہے۔"

لدھا رام والے کیس کے سلسلہ میں ایک گواہ سید مقبول شاہ جو اُن دنوں لالہ موسیٰ میں ہیڈ کانسٹیبل تھا مجھتا ہے۔ "جب میں ہائی کورٹ میں شاہ جیؒ کے خلاف شہادت دینے کے لئے گیا تو لاہور میں سپرنٹنڈنٹ سی۔ آئی۔ ڈی نے مجھے خاص طور پر ہدایت کی کہ دورانِ شہادۃ شاہ جیؒ سے آنکھ نہ ملانا۔ اگر آنکھ مل گئی تو شہادۃ نہ دے سکو گے۔ اس لئے شہادۃ کے وقت پاؤں کے ناخن پر نگاہ رکھنا ــــ تاکید ہے۔ چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا۔" یہ واقعہ حضرت مرحوم کی مقناطیسی شخصیت کی ایک ادنیٰ مثال ہے۔

آپ کے چھوٹے چھوٹے فقرے طباعی اور ذہانت کے ساتھ بہت سی حقیقتیں اور صداقتیں اپنے اندر لئے ہوئے تھے، جن سے فہیم انسان دُور تک جا پہنچتا تھا۔ ایک بار ایک صاحب نے دریافت کیا کہ حضرت خدیجہؓ اور حضرت عائشہؓ میں باعلم کیا فرق ہے؟ تو فرمایا: "خدیجہؓ کا نکاح محمد بن عبداللہ سے ہوا اور عائشہؓ کا نکاح محمد رسول اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ہوا۔" ایسے ہی ایک بار حضرت عمرؓ اور حضرۃ علیؓ کے مابین فرق یوں بتایا کہ "علیؓ مُرید تھے اور عمرؓ مراد تھے"۔ فرقِ مراتب کی یہ کس قدر بلند تعبیر ہے۔ ایک بار

فرمایا: "میری قوم کی نفسیات یہ ہے کہ یہ ڈنڈے والے کے آگے آگے اور دولت والے کے پیچھے پیچھے بھاگتی ہے"

شاہ جی دُوسروں کی عیوب کی پَردہ پوشی فرماتے تھے۔ اپنے بدترین دشمن کا ذکر کرتے ہوئے بھی اخلاق کا دامن پکڑے رہتے تھے۔ عالی ظرفی اور بلند حوصلگی کی یہ صفت بہت کم لوگوں میں ہوتی ہے۔ کسی کی دل آزاری ان کا شیوہ نہ تھا۔ صُلحِ کُل ان کا مسلک تھا۔ ان کے منہ سے کسی نے جھُوٹی بات نہیں سنی۔ وہ اس بات یا روایت کو ہرگز بیان نہ کرتے جس کی صحت میں انہیں ذرّہ برابر بھی شک ہوتا۔ بے حد منکسر المزاج تھے۔ آخری ایام میں ایک بار فرما رہے تھے: "میری زندگی ہی کیا ہے؟ میں کیا ہوں؟ نہ نبی ہونہ ولی۔ خُدا کی مخلوق میں سب سے بُرا اور عاجز!! میرے گناہوں پر میرے مالک نے پَردہ ڈال دیا ہے ورنہ عطاء اللہ جیسے کروڑوں مارے مارے پھرتے ہیں جنہیں کوئی جانتا تک نہیں۔ یہ اُس کا کرم ہے کہ اس نے قُرآن کی کچھ خدمت مجھ سے لے لی۔ اور اس پر بھی کوئی دعویٰ نہیں۔ استغفر اللہ! پوری زندگی میں کہا ہوا کوئی ایک حرف بھی قبول ہوگیا تو نجات ہوجائے گی۔ انشاء اللہ ـــــ نجات کی اُمید ضرور رکھتا ہوں۔ کیونکہ اتنا مجھے یقین ہے کہ میں نے اُس کے سوا کسی کو خدا نہیں مانا۔ اور میاں صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی کو ان کا حریف بنتے دیکھنا میں برداشت نہیں کرسکتا اور کوئی عمل میرے پلّے نہیں، بس اُسی کے فضل وکرم کے سہارے جی رہا ہوں"۔

شاہ جیؒ کی ایک بہت نمایاں خُوبی ان کی زندہ دِلی اور بذلہ سنجی تھی۔ مصائب آلام کے ہجوم میں ہمیشہ ہنستے ہنساتے رہے۔ یہاں تک کہ مرض الموت میں فالج کے حملہ کا واقعہ اپنے رفقاء کو یُوں سُنایا: "اچھا بھلا اُٹھا وضو کرنے لگا تو ہاتھ نے سول نافرمانی شروع کردی، منہ میں پانی ڈالا تو اُس نے بھی بغاوت اختیار کی۔ میں سمجھ گیا کہ فالج کا حملہ ہوا ہے اور اب میں مرنے لگا ہوں۔ جلدی جلدی وضو کیا۔ صبح کی نماز ادا کی اور زور زور سے پڑھا اَشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ واشھد ان محمداً عبدہ ورسولہ، لا نبی بعدہٗ ولا رسول بعدہ: اور چارپائی پر لیٹ گیا کہ اب موت آئی تو خاتمہ انشاء اللہ ایمان پر ہوجائے گا۔ تھوڑی دیر لیٹا رہا اور موت کا انتظار کرتا رہا لیکن موت نہ آئی۔ اب اُٹھا۔ اندر گیا۔ بھُوک لگ رہی تھی۔ کھانا مانگا۔ رات کی ٹھنڈی کھچڑی کھالی۔ البتہ ایک غلطی ہوگئی جس کے لئے اللہ سے معافی مانگتا ہوں آپ لوگ بھی معاف کردینا۔ وہ یہ کہ ٹھنڈی کھچڑی کے بعد گھڑے کا ٹھنڈا پانی پینا بھُول گیا۔ بس یہ کسر رہ گئی"۔

آپؒ یہ باتیں مزے لے لے کر کہہ رہے تھے اور حاضرین یہ سوچنے پر مجبور تھے کہ فالج کا حملہ ہے، منہ پر لقوہ کا اثر ہے، زبان میں بھی لکنت آچکی ہے لیکن شاہ جیؒ کی ظرافت اور زندہ دِلی میں کوئی تغیّر نہیں ہوا۔

۹ ربیع الاول ۱۳۸۱ھ مطابق ۲۱ اگست ۱۹۶۱ء کی شب اہلِ ملتان نے یہ دلخراش خبر سنی کہ محفلِ عزم و عمل کا وہ چراغ جو کئی برس سے مرض و ضعف کے شدید جھونکوں سے بجھ بجھ کر سنبھل جاتا تھا۔ ۷۲ برس کی جفا گستریوں کے بعد بالآخر آج شام چھ بج کر پچپن منٹ پر ہمیشہ کے لئے بجھ گیا۔ وہ جس کے دروازے پر بڑے بڑے رؤسا، آفیسرز، وزراء، علماء اور صوفیاء حاضری دینا باعثِ صد افتخار گردانتے تھے کرائے کے ایک بوسیدہ مکان میں اپنی زندگی گزار کر خوش رہا۔ بڑے بڑے بادشاہوں کے جنازے یوں نہ اُٹھے ہوں گے جیسے اس فقیر کا جنازہ اُٹھا۔ جنازہ اُٹھائے جانے کے وقت دو لاکھ سے زائد خوش قسمت عقیدت مندوں نے ایمرسن کالج گراؤنڈ ملتان میں آپ کے بڑے فرزند اور جانشین **حضرۃ ابو معاویہ** ابوذر بخاری **مدظلہ** العالی کی امامت میں نمازِ جنازہ ادا کی۔ ڈپٹی کمشنر ملتان نے حکومت کی جانب سے قلعۂ ملتان میں تدفین کی پیشکش کی لیکن چونکہ آخری ایام میں آپ اکثر فرماتے تھے "اللہ مجھے ایسے مقام پر قبر نصیب کرے جو سرِ راہ ہو اور آتے جاتے لوگ فاتحہ پڑھ جایا کریں" اس لئے یہ پیشکش نامنظور کر دی گئی۔ ۲۲ اگست کی شام چھ بجے جلال باقری قبرستان میں برلبِ سڑک آپ کو سپردِ لحد کیا گیا۔ سید عالی مقام رح ہمیشہ کے لئے منوں مٹی تلے سو گئے۔ لوگوں کی گریہ وزاری کی انتہا ہو گئی۔ برصغیر کی تحریکِ آزادی اور جہادِ دین کا ایک نہایت منوّر باب اپنے اختتام کو پہنچا اور دنیا اس بلبلِ ہزار داستان کی نغمہ طرازیوں اور خوش الحانیوں سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو گئی جو خرمنِ باطل پر بجلی کی مانند ٹوٹتی تھیں ؎

آج مٹی کا وہاں ڈھیر سا ہو گا ساغر ٭ سر جھکاتی تھی جہاں لوح و قلم کی دنیا

اپنے توشۂ آخرت میں حضرت شاہ جی رح جو کچھ لے گئے اس میں حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رح کے یہ الفاظ بھی ہیں "ان کی باتیں تو عطاءِ الٰہی ہوتی ہیں" جو بے شک قابلِ صد فخر و رشک متاع ہے۔ فرمانروائی آپ رح کی عبا اُٹھائے پھری۔ آپ لیلائے خطابت کے ماتھے کا جھومر اور اس کے سر کا تاج تھے۔ آپ رح کیا گئے خطابت بیوہ ہو گئی۔ شورش کاشمیری نے آپ رح کے بارے میں کہا "شاہ جی رح اگر قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں میں ہوتے تو یقیناً "ایک جلیل القدر صحابی ہوتے"۔ صدرِ پاکستان فیلڈ مارشل ایوب خان نے آپ رح کے علاج کے لئے تعاون کیا۔ آپ رح کی وفات پر ایک تعزیتی پیغام میں لکھا "سید عطاء اللہ شاہ بخاری رح کی وفات سے مجھے بے حد رنج ہوا ہے۔ آپ رح جنگِ آزادی اور اسلام کے ایک زبردست مجاہد تھے اور قدرت نے آپ کو علم و فصاحت کی نعمتیں ودیعت کی تھیں۔ موت نے ہم سے ایک عظیم شخصیت جدا کر دی۔ خدا آپ رح